امریکی معاشی ہتھیار اور عالمی مزاحمت: ایک جامع تجزیاتی مطالعہ

سید محمد یونس قادری
smyounus121@gmail.com

ابتدائیہ

موجودہ عالمی نظام ایک بنیادی تبدیلی سے گزر رہا ہے جہاں طاقت کا انحصار محض عسکری قوت کے بجائے معاشی ”مقامِ تسلط“ (Chokepoints) پر منتقل ہو چکا ہے۔ ایڈورڈ فشمن (Edward Fishman) معاشی ریاستی حکمتِ عملی (economic statecraft) اور پابندیوں (sanctions) کے شعبے کے ایک نمایاں ماہر ہیں۔ وہ اس سے قبل امریکی محکمۂ خارجہ میں سیکرٹری آف اسٹیٹ کی پالیسی پلاننگ اسٹاف کے رکن رہ چکا ہے اور امریکی محکمۂ خزانہ میں بھی خدمات انجام دے چکا ہے، جہاں اس نے معاشی پابندیوں کی تشکیل اور نفاذ پر کام کیا۔ وہ اس وقت مختلف علمی و پالیسی اداروں سے وابستہ ہے اور مقامات تسلط کے موضوع پر ایک اہم کتاب Chokepoints: American Power in the Age of Economic Warfare کا مصنف ہے، جس میں اس نے یہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ کس طرح مالیاتی اور تکنیکی نظام، عالمی سیاست میں طاقت کے آلات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے تجزیے کے مطابق یہ وہ شعبے ہیں جہاں کنٹرول محدود، متبادل نایاب اور اثرات غیر متوازن ہوتے ہیں[1]۔ امریکہ نے ڈالر، مالیاتی نظام اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اس میدان میں طویل عرصے سے برتری قائم کر رکھی ہے، مگر ان ہتھیاروں کے بے لگام استعمال نے دنیا کو متبادل نظام بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ عالمی نظام اب یک قطبی سے کثیر قطبی (Multipolar) ڈھانچے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس

مضمون کا مقصد فیشمین کے تجزیہ کے روشنی میں اس نئی معاشی جنگ کی نوعیت کو سمجھنا، امریکی حکمتِ عملی اور اس کی کمزوریوں کا تجزیہ کرنا، اور مسلمان دنیا کے لیے ایک متوازن اور قابلِ عمل لائحۂ عمل پیش کرنا ہے۔

ایڈورڈ فشمن امریکی مجلہ فارن افیئرز کے ایک تازہ شمارے میں اپنے مضمون میں ان "نادیدہ بنیادی ڈھانچوں" (Invisible Infrastructure) کو بے نقاب کرتا ہے جو امریکی ڈالر اور ٹیکنالوجی کے غلبے پر کھڑے ہیں۔ یہ مضمون اسی فریم ورک کو بنیاد بنا کر اس نظام کی تکنیکی ساخت، اس کے بطور ہتھیار استعمال، اور اس کے خلاف عالمی ردعمل کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔

امریکہ کا مالیاتی نظام: SWIFT اور CHIPS بطور عالمی کنٹرول نیٹ ورک

عالمی معیشت میں امریکی طاقت کا سب سے اہم ستون اس کا مالیاتی انفراسٹرکچر (ڈھانچہ) ہے جو دنیا کی تمام بڑی ادائیگیوں کو اپنے نیٹ ورک سے گزرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نظام کے دو بنیادی ستون سوئفٹ (SWIFT) اور چپس (CHIPS) ہیں۔ سوئفٹ دراصل ایک عالمی پیغام رسانی کا نیٹ ورک ہے جو بینکوں کے درمیان ادائیگیوں کی ہدایات منتقل کرتا ہے۔ یہ نظام خود رقم منتقل نہیں کرتا بلکہ صرف پیغام رسانی کا کردار ادا کرتا ہے۔ تاہم اس کی اصل طاقت اس کے نیٹ ورک اثر (network effect) میں ہے، کیونکہ دنیا کے ہزاروں مالیاتی ادارے اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس انحصار کی وجہ سے اگر کسی ملک یا بینک کو SWIFT سے باہر کر دیا جائے تو وہ عالمی مالیاتی نظام سے تقریباً کٹ جاتا ہے اور بین الاقوامی تجارت میں شرکت کے لیے شدید رکاوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح CHIPS وہ مرکزی نظام ہے جہاں امریکی ڈالر کی اصل کلیئرنگ اور تصفیہ ہوتا ہے۔ یہ نظام نہ صرف ادائیگیوں کو پراسیس کرتا (انجام دیتا) ہے بلکہ انہیں باہم منسلک بھی کرتا ہے، یعنی متعدد ادائیگیوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں ایڈجسٹ (ہم آہنگ) کر کے صرف خالص رقم منتقل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر دو بینک ایک دوسرے کے مقابلے میں مختلف رقوم کے

قرض دار ہوں تو CHIPS ان کو جمع کر کے صرف فرق کی ادائیگی کراتا ہے۔ اس تکنیک سے عالمی سطح پر کھربوں ڈالر کی لین دین محدود لیکویڈیٹی ("پیسوں") میں ممکن ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امریکی مالیاتی نظام کی سب سے بڑی طاقت جنم لیتی ہے، کیونکہ یہ نظام دنیا کو ڈالر کا محتاج بھی رکھتا ہے اور حقیقی کرنسی کے بہاؤ کو نسبتاً محدود بھی رکھتا ہے۔ چپس (CHIPS) کا ایک اور اہم پہلو اس کا امریکی مرکزی "بینک" فیڈرل ریزرو (Federal Reserve) کے ساتھ تعلق ہے، جہاں ہر رکن بینک کو پہلے سے متعین رقوم جمع کروانی پڑتی ہیں تاکہ دن بھر کی ادائیگیاں ممکن ہو سکیں۔ اس طرح پورا نظام قبل از وقت فراہم کردہ رقوم کے ذخائر (pre-funded liquidity pool) پر چلتا ہے۔ اس ڈھانچے کی وجہ سے امریکہ نہ صرف عالمی ادائیگیوں کے بہاؤ پر نظر رکھ سکتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی ادارے کو اس نظام سے خارج بھی کر سکتا ہے۔ اس پورے ڈھانچے کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈالر عالمی معیشت کی "لیکویڈیٹی لائف لائن" (liquidity life line) یعنی سیالیت کی شہ رگ بن چکا ہے۔ دنیا تیل، خوراک اور اشیاء کے بدلے براہِ راست حقیقی قدر (value) نہیں بلکہ ڈالر میں ناپی جانے والی برقی (ڈیجیٹل) قدر حاصل کرتی ہے۔ امریکہ کے لیے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ سینیوریج (Seigniorage) یعنی کرنسی کے اجراء سے حاصل ہونے والا غیر معمولی معاشی فائدہ حاصل کرتا ہے، جبکہ باقی دنیا حقیقی اشیاء فراہم کر کے محض ڈیجیٹل ڈالر حاصل کرتی ہے[۲]۔

معاشی چوک پوائنٹس: تجارت، ٹیکنالوجی اور مالی دباؤ

امریکہ کی معاشی طاقت صرف مالیاتی نظام تک محدود نہیں بلکہ یہ تجارت اور ٹیکنالوجی کے مختلف مقامات تسلط (چوک پوائنٹس) پر بھی قائم ہے۔ برآمدی کنٹرول کے ذریعے امریکہ جدید ٹیکنالوجی خصوصاً سیمی کنڈکٹرز اور سافٹ ویئر پر سخت پابندیاں لگاتا ہے۔ Huawei اور ZTE جیسے واقعات اس بات کی مثالیں ہیں کہ کس طرح رسدی زنجیر (سپلائی چین) کی ایک کڑی کو روک کر پوری کمپنی کی عالمی کارکردگی متاثر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس حکمت عملی

کی کمزوری یہ ہے کہ طویل مدت میں یہ متاثرہ ممالک کو اپنی مقامی ٹیکنالوجی تیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، جس سے امریکی انحصار خود کم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح امریکہ اپنی بڑی صارف منڈی (Consumer Market) کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے [۳]۔ محصولات (ٹیرف) اور تجارتی پابندیاں ان ممالک پر عائد کی جاتی ہیں جو امریکی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ اگرچہ اس سے مخالف ممالک پر دباؤ بڑھتا ہے، لیکن اس کے اثرات خود امریکی معیشت اور صارفین پر بھی پڑتے ہیں کیونکہ عالمی رسدی زنجیر (سپلائی چین) مہنگی اور غیر مستحکم ہو جاتی ہے۔ مزید بر آں، آئی ایم ایف (IMF) اور ورلڈ بینک (World Bank) جیسے اداروں کے ذریعے مالی امداد اور قرضوں کو سیاسی اور جغرافیائی حکمت عملی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کئی ترقی پذیر ممالک مالیاتی انحصار کے ایک ایسے دائرے میں پھنس جاتے ہیں جہاں پالیسی خود مختاری محدود ہو جاتی ہے۔ تاہم چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو (BRI) جیسے اقدامات اس نظام کے متبادل کے طور پر ابھر رہے ہیں (اگرچہ یہ عمل سست اور ناہموار رہے)۔

عالمی ردعمل اور متبادل نظاموں کا ابھار

امریکی معاشی دباؤ کے ردعمل میں دنیا کے مختلف ممالک نے متبادل نظاموں کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ چین نے سِپس (CIPS) کے ذریعے سوئفٹ (SWIFT) کے متبادل ادائیگی نظام کی بنیاد رکھی ہے، جبکہ ڈیجیٹل (برقی) یوآن کے ذریعے ایک مرکزی بینک ڈیجیٹل کرنسی متعارف کروائی ہے جو امریکی مالیاتی نگرانی سے نسبتاً آزاد ہے۔ روس نے ایس پی ایف ایس (SPFS) نظام کے ذریعے اپنی مالیاتی خود مختاری کو مضبوط کیا ہے اور اپنی معیشت کو ڈالر کے بجائے سونے اور یوآن کی طرف منتقل کیا ہے۔ ایران نے پابندیوں کے باوجود بارٹر سسٹم، خفیہ مالیاتی نیٹ ورکس اور غیر رسمی تجارت کے ذریعے اپنی معیشت کو برقرار رکھا ہے، جبکہ افغانستان نے بینکنگ نظام کے محدود ہونے کے باوجود ہنڈی اور حوالہ جیسے روایتی نظاموں کو دوبارہ فعال کیا ہے۔ یہاں تک کہ شمالی کوریا نے تو سائبر سرگرمیوں اور کرپٹو

کرنسی نیٹ ورکس کے ذریعے عالمی مالیاتی نظام کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جوں جوں مالیاتی اور ٹیکنالوجیکل مقام تسلط / چوک پوائنٹس کو ہتھیار بنایا جاتا ہے، یوں یوں دنیا ان کا متبادل پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

فشمن کا مرکزی خیال اور معاشی جنگ کی نوعیت

ایڈورڈ فشمن کے مطابق معاشی جنگ تین بنیادی سطحوں پر کام کرتی ہے: علامتی دباؤ، تدریجی کمزوری، اور براہ راست جبر۔ تاہم ان تمام حکمت عملیوں کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ حقیقی مقامات تسلط (chokepoints) پر مبنی ہیں یا نہیں۔ غیر حقیقی معاشی ہتھیار اکثر خود استعمال کرنے والے کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، جبکہ حقیقی مقامات تسلط (چوک پوائنٹس) جیسے ڈالر کا نظام یا نیم موصلات (سیمی کنڈکٹرز) کی رسدی زنجیر (سپلائی چین) متعلقہ ملک کو غیر معمولی طاقت فراہم کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ عالمی نظام ایک واضح تبدیلی سے گزر رہا ہے جہاں ایک طرف امریکہ مالیاتی اور ٹیکنالوجیکل برتری رکھتا ہے جبکہ دوسری طرف چین صنعتی پیداوار اور رسدی زنجیر (سپلائی چین) پر غالب ہے۔ اس توازن نے دنیا کو ایک کثیر قطبی معاشی ڈھانچے میں تبدیل کر دیا ہے جہاں کوئی ایک قوت مکمل کنٹرول میں نہیں رہی[۴]۔

آزاد تجارت (فری ٹریڈ) کا بحران اور متبادل نظریات

روایتی آزاد تجارت ماڈل اب شدید تنقید کا شکار ہے۔ رابرت لائیٹھائزر اور مائیکل پیٹس[۱] جیسے

---

[۱] Robert E. Lighthizer ایک امریکی تجارتی قانون دان اور پالیسی ساز ہیں جو ۲۰۱۷ سے ۲۰۲۱ تک ریاستہائے متحدہ کے تجارتی نمائندے (United States Trade Representative) کے طور پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے امریکی تجارتی پالیسی کی تشکیلِ نو میں مرکزی کردار ادا کیا خصوصاً "America First" حکمتِ عملی، تجارتی معاہدوں کی از سرِ نو تشکیل اور ٹیرف کو ایک اسٹریٹجک

ماہرین کے مطابق آزاد تجارت نے عالمی سطح پر عدم توازن، صنعتی زوال اور معاشی انحصار کو بڑھایا ہے۔ امریکہ بطور آخری چارے کے صارف "consumer of last resort" عالمی پیداوار کو جذب کرتا رہا جس سے دیگر ممالک کو فائدہ تو ہوا مگر اس کے نتیجے میں خود امریکی صنعتی ڈھانچہ کمزور ہو گیا۔ اسی لیے اب "متوازن تجارت" اور ریاستی مداخلت پر مبنی پالیسیوں کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان مفکرین ہی کی فکر کے تحت امریکہ نے اپنی تجارت پر نئی محصولاتی (ٹیرف) پالیسی کو متعارف کروایا جس سے بقول فشمن کے امریکہ کے دوست یورپی ممالک ناراض ہیں۔ جس کو فشمن ایک مقام تسلط کے بجائے کمزور پالیسی سے تعبیر کرتا ہے۔ مگر رابرٹ لائیٹھائزر (Robert Lighthizer) اس کو امریکی حکومت کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے اور اس ہی کے مشوروں پر ٹرمپ کی کابینہ نے محصولاتی (ٹیرف) پالیسی اپنائی۔

پس جدیدیت، قوم پرستی اور سرمایہ داری کی پسپائی

امریکی معیشت کی تاریخی طاقت، دو بنیادی ستونوں صارفیت (کنزیومرزم) اور مالیاتیت (فائننشلزم) پر قائم رہی ہے، مگر آج یہی ستون اس کے داخلی بحران کا سبب بن رہے ہیں۔ مائیکل پیٹس (Michael Pettis) کے آخری چارے کے صارف کے تصور کے مطابق امریکہ نے عالمی پیداوار کو سہارا دیا کہ امریکہ ایک صارف پسند قوم ہے جو بچت کم کرتی ہے اور صرف زیادہ، جس سے اس کو تجارتی خسارہ رہتا ہے۔ بہت سے ممالک خاص کر چین، یورپ زائد پیداوار کو امریکی منڈیوں میں فروخت کر کے اپنے تجارتی خسارہ کو کم کر لیتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں امریکہ کا داخلی صنعتی ڈھانچہ کمزور اور معاشی عدم توازن شدید ہو گیا

ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے میں۔ ان کا کام متوازن تجارت (balanced trade) اور قومی صنعت کے تحفظ میں ریاست کے فعال کردار پر زور دیتا ہے۔ Michael Pettis امریکی ماہرِ معاشیات اور پیکنگ یونیورسٹی کے Guanghua School of Management میں فنانس کے پروفیسر ہیں جو عالمی مالیاتی نظام، تجارتی عدم توازن اور چین کی معیشت پر تنقیدی تحقیق کے لیے معروف ہیں۔

ہے[۵]۔ دوسری جانب پوسٹ کینزین مفکرین نے مالیاتیت (فائنشلائزیشن) پر تنقید کرتے ہوئے واضح کیا کہ مالیاتی شعبے کی غیر معمولی بالادستی نے حقیقی معیشت کو پس پشت ڈال دیا ہے، جبکہ ماحولیاتی مفکرین سرمایہ دارانہ ترقی کے ماڈل کو فطری حدود سے متصادم قرار دیتے ہیں۔

اسی تناظر میں موجودہ دور کو بجا طور پر پس جدیدیت (Postmodernity) کا دور کہا جا سکتا ہے، جہاں سرمایہ دارانہ جدیدیت کے بڑے بیانیے جیسے لامحدود ترقی، آزاد منڈی اور عالمگیریت اپنی کشش کھو رہے ہیں۔ اب قومیں اس بات کے لیے تیار نہیں کہ وہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بقاء کے لیے اپنی داخلی معیشت، صنعت اور سماجی استحکام کو قربان کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی جمہوریتوں میں ایک نیا سیاسی و معاشی رجحان ابھر رہا ہے جسے سادہ الفاظ میں "میرا ملک پہلے" (My Country First) کہا جا سکتا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی قوم پرستانہ پالیسیوں نے اس رجحان کو واضح شکل دی، مگر یہ صرف امریکہ تک محدود نہیں رہا بلکہ یورپ اور دیگر مغربی معاشروں میں بھی یہی سوچ پروان چڑھ رہی ہے[۶]۔ اس تبدیلی کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ وہی ریاستیں جو کبھی عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی محافظ تھیں، اب خود اس سے پیچھے ہٹ رہی ہیں اور اپنے قومی مفادات کو ترجیح دے رہی ہیں۔ اس صورت حال کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام اب اپنی محافظ ریاست سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور یوں دنیا ایک ایسے عبوری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں:

- سرمایہ داری کا پرانا عالمی ڈھانچہ سکڑ رہا ہے
- قوم پرستی اور علاقائیت ابھر رہی ہے اور
- کوئی واضح متبادل نظام ابھی مکمل طور پر سامنے نہیں آیا

یہ محض ایک معاشی تبدیلی نہیں بلکہ ایک گہرا تہذیبی اور فکری انتقال ہے جس میں جدید سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی تصورات تحلیل ہو رہے ہیں اور ایک نئے عالمی نظم کی تشکیل کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔

ہمارا لائحۂ عمل: مقامِ تسلط کی تلاش اور خود مختار نظام کی تشکیل

اس تناظر میں مسلمان دنیا کے لیے بنیادی سوال یہ نہیں کہ وہ عالمی معاشی جنگ سے کیسے بچے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنی حیثیت کیسے متعین کرے۔ پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی "مقامِ تسلط" کو پہچانیں اور مغربی نظام کی طاقت اور کمزوری دونوں کا غیر جذباتی تجزیہ کریں۔ ہر ملک کی طرح مسلمان دنیا کے بھی مخصوص میدان ہیں جہاں وہ برتری حاصل کر سکتی ہے۔ مغرب اگرچہ مصنوعی ذہانت (AI) اور جدید ٹیکنالوجی میں آگے ہے، مگر اس کا سرمایہ دارانہ و سماجی ماڈل اپنی داخلی تضادات کا شکار ہے خاندانی نظام کی کمزوری، آبادی کی سست رفتار افزائش، اور سماجی انتشار اس کے طویل مدتی استحکام کو متاثر کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان دنیا کی نوجوان آبادی ایک ممکنہ "مقامِ تسلط" ہے، بشرطیکہ اسے محض برآمد کرنے کے بجائے علم، ہنر اور مقصدیت کے ساتھ اپنی معیشت اور تہذیب کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔ وسائل کے اعتبار سے بھی مسلمان دنیا کسی کمی کا شکار نہیں۔ زراعت، معدنیات اور جغرافیائی اہمیت اسے خود کفالت کی بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔ مسئلہ وسائل کی قلت نہیں بلکہ حکمتِ عملی کا فقدان ہے۔ اسلام کی سادہ اور متوازن طرزِ زندگی نہ صرف معاشی اعتدال پیدا کرتی ہے بلکہ ماحولیاتی بگاڑ کو بھی محدود کر سکتی ہے، جو آج کے سرمایہ دارانہ نظام کا ایک بڑا بحران ہے۔ اسی طرح علمی میدان میں یہ تصور کہ مسلمان دنیا مغربی علوم سے محروم ہے، یک رخا ہے۔ اگر اس خلا کو اپنی علمی روایت، یعنی اسلامی علمیت اور فکری خود اعتمادی کے ساتھ جوڑا جائے تو یہ کمزوری نہیں بلکہ ایک الگ تہذیبی شناخت اور بالآخر ایک ممکنہ قوت بن سکتی ہے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں حکمتِ عملی دفاعی خود مختاری پر مبنی ہونی چاہیے۔ ایران، پاکستان، چین اور روس کی مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ بیرونی انحصار کے بغیر بھی اہم دفاعی اور اسٹریٹجک صلاحیتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس دائرے میں پیش رفت صرف ہتھیاروں تک محدود نہیں بلکہ تحقیق، انجینئرنگ، اور مقامی صنعتی بنیاد کی مضبوطی سے جڑی ہے۔ ایک دین سے آراستہ، باحوصلہ، تعلیم یافتہ اور منظم نوجوان طبقہ ہماری دفاعی

حکمتِ عملی کی اصل قوت بن سکتا ہے۔ معاشی استحکام کے لیے پہلا قدم بیرونی مالیاتی انحصار کو کم کرنا ہے، خصوصاً ایسے قرضہ جاتی ڈھانچوں سے جو پالیسی خود مختاری کو محدود کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک متبادل مالیاتی ماڈل کی ضرورت ہے جو حقیقی معیشت یعنی پیداوار، تجارت اور خدمات سے جڑا ہو، نہ کہ محض مالیاتی ببل پر۔ اسلامی تمویلی اصول اس حوالے سے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ انہیں جدید ادارہ جاتی ڈھانچے اور شفاف حکمرانی کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ مزید برآں، تجارت کا دائرہ وسیع کر کے چین، افریقہ، وسطی ایشیا اور باہمی مسلمان منڈیوں کے ساتھ روابط بڑھانا ضروری ہے، تاکہ ایک متوازن اور متنوع تجارتی نظام تشکیل پائے۔ طویل مدتی سطح پر ایک مربوط اسلامی اقتصادی بلاک کا قیام اس حکمتِ عملی کا اہم ستون ہو سکتا ہے، جہاں مشترکہ تجارتی، مالیاتی اور صنعتی پالیسیاں تشکیل دی جائیں۔ اس سے نہ صرف بیرونی دباؤ کم ہو گا بلکہ اجتماعی سودے بازی کی طاقت بھی بڑھے گی۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ سرمایہ دارانہ عالمی نظام خود داخلی بحرانوں مالیاتی عدم استحکام، تورم یعنی انفلیشن، بے روزگاری اور ماحولیاتی تباہی کا شکار ہے۔ یہی اس کے وہ "کمزور پوائنٹس" ہیں جنہیں سمجھ کر اپنا نیا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ آخرکار، فشمن کے تجزیے سے یہ سبق ملتا ہے کہ معاشی جنگ صرف بڑی طاقتوں کا میدان نہیں رہی۔ یہ ہر ریاست کے لیے ایک امتحان بھی ہے اور موقع بھی۔ کامیابی اسی کی ہے جو اپنی کمزوریوں کو پہچان کر انہیں قوت میں بدل دے، اپنے حقیقی "مقامِ تسلط" کی درست نشاندہی کرے اور ایک متوازن، خود مختار اور پائیدار معاشی حکمتِ عملی اختیار کرے۔ یہی راستہ مسلمان دنیا کو نئے عالمی نظام میں محض بقاء نہیں بلکہ باوقار اور مؤثر کردار کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اختتامیہ

موجودہ عالمی نظام ایک عبوری مرحلے سے گزر رہا ہے جہاں معاشی طاقت، ٹیکنالوجی اور مالیاتی ڈھانچے نئی عالمی سیاست کو تشکیل دے رہے ہیں۔ ایڈورڈ فشمن کا تجزیہ ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ

معاشی جنگ محض بڑی طاقتوں کا کھیل نہیں بلکہ ہر ملک کے لیے ایک موقع بھی ہے۔ مسلمان دنیا کے لیے اصل راستہ یہ نہیں کہ وہ کسی ایک طاقت کے خلاف کھڑی ہو، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی صلاحیتوں کو منظم کر کے ایک خود مختار، متوازن اور پائیدار نظام تشکیل دے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے حقیقی "مقامِ تسلط" کو پہچانیں، جدید علم و ٹیکنالوجی کو اپنائیں، اور اپنی تہذیبی بنیادوں کے ساتھ ایک نئی معاشی فکر کو فروغ دیں۔ اگر یہ حکمتِ عملی اختیار کی جائے تو مسلمان دنیا نہ صرف موجودہ عالمی نظام میں باوقار مقام حاصل کر سکتی ہے بلکہ ایک زیادہ منصفانہ اور متوازن عالمی معاشی نظام کی تشکیل میں بھی کردار ادا کر سکتی ہے۔

حوالہ جات و توضیحات

ا۔ اس فریم ورک میں، جب یہ کہا جاتا ہے کہ "جہاں کنٹرول محدود ہوتا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مخصوص معاشی چوک پوائنٹس (مقامِ تسلط) پر پوری دنیا یا عام مارکیٹ کا کنٹرول محدود ہوتا ہے اور متبادل تلاش کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ ایڈورڈ فشمن کے اس تجزیے کے مطابق، ان چوک پوائنٹس پر کنٹرول کے محدود ہونے کا تفصیلی مفہوم درج ذیل ہے:

مرکزی قوت کا اجارہ: اس نظام میں کنٹرول عام بین الاقوامی اداروں یا اکثریتی ممالک کے ہاتھ میں نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس مخصوص طاقت (جیسے امریکہ) کے پاس محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو اس نیٹ ورک کی مالکانہ حیثیت رکھتی ہے۔

متبادل کی عدم موجودگی: چونکہ ان نیٹ ورکس (جیسے SWIFT یا CHIPS) پر عام عالمی نظام کا کنٹرول محدود یا نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے کوئی بھی ملک اپنی مرضی سے اس کے متبادل کو آسانی سے تیار یا کنٹرول نہیں کر سکتا۔

غیر متوازن اثرات: کنٹرول کے چند ہاتھوں میں محدود ہونے کی وجہ سے، ان چوک پوائنٹس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والی طاقت دنیا بھر پر غیر متوازن معاشی اور سیاسی اثرات ڈالنے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔

۲۔ سینیوریج (Seigniorage) کا مطلب ہے "نوٹ بنانے کی لاگت اور اس نوٹ کی مارکیٹ میں قوتِ خرید کے درمیان کا فرق"۔ اس کو ایک عام مثال سے دیکھتے ہیں:

ا۔ حقیقی لاگت: فرض کریں کہ سٹیٹ بینک کو ۵۰۰۰ روپے کا ایک نوٹ چھاپنے پر (کاغذ، سیاہی اور مشینری کا خرچ ملا کر) صرف ۵ روپے کا خرچ آتا ہے۔

۲۔ ظاہری قدر (Face Value): اس نوٹ کے اوپر جو قیمت لکھی ہوئی ہے، وہ ہے ۵۰۰۰ روپے۔
اب جب یہ ۵ روپے کی لاگت کا نوٹ بازار میں آتا ہے تو حکومت یا بینک اس کے بدلے پورے ۵۰۰۰ روپے کی مالیت کا سامان (مثلاً گندم، سونا یا پیٹرول) خرید سکتے ہیں۔

نوٹ بنانے پر خرچ ہوا: ۵ روپے

اس نوٹ سے چیز خریدی گئی: ۵۰۰۰ روپے کی

حکومت کو بیٹھے بٹھائے کتنا فائدہ ہوا؟ ۴۹۹۵ روپے (۵۰۰۰-۵=۴۹۹۵)

یہ جو ۴۹۹۵ روپے کا خالص منافع ہے، اسی کو معاشی اصطلاح میں Seigniorage کہتے ہیں۔
جب ہم امریکہ کی بات کرتے ہیں تو یہ فائدہ عالمی سطح پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ وہ صرف چند سینٹ کا خرچ کر کے سو ڈالر کا نوٹ ڈیجیٹل طور پر جاری کرتا ہے، اور باقی دنیا (جیسے چین یا عرب ممالک) اس چند سینٹ کے نوٹ کے بدلے اپنے حقیقی وسائل، سستی لیبر اور قیمتی تیل امریکہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی وہ معاشی جادو ہے جس کے ذریعے امریکہ دنیا کے حقیقی اثاثے محض کاغذ یا ڈیجیٹل ہندسے چھاپ کر سمیٹ رہا ہے۔

۳۔ جب یہ کہا جائے کہ "امریکہ اپنی بڑی صارف منڈی کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی عوام دنیا بھر کی مصنوعات کے سب سے بڑے خریدار ہیں۔ اگر امریکہ کسی ملک پر تجارتی پابندیاں لگا کر اپنی مارکیٹ (صارف منڈی) اس کے لیے بند کر دے، تو اس مخالف ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا مال خریدنے والا کوئی نہیں رہتا۔ مائیکل پیٹس کے تصور کے مطابق، امریکہ دنیا کی سب سے بڑی "صارف منڈی" ہے جو دنیا بھر کی سرپلس (زائد) پیداوار کو اپنے اندر جذب کرتی ہے، کیونکہ وہاں بچت کا رجحان کم اور اشیاء خریدنے کا رجحان زیادہ ہے۔

۴۔ موجودہ دور میں عالمی سامراج (global imperialism) کے تین بنیادی مراکز ہیں:

ا۔ امریکہ (America):

امریکہ اب بھی دنیا کی سب سے غالب سامراجی قوت ہے۔ اس نے دنیا بھر کو اپنے تقریباً ۲۰۰ عسکری اڈوں کے ذریعے حصار میں لے رکھا ہے۔ عالمی اداروں کا پورا ڈھانچہ، جیسے کہ آئی ایم ایف (IMF)، عالمی تجارتی ادارہ (WTO)، وائپو (WIPO)، ایف اے ٹی ایف (FATF)، نیٹو (NATO) اور ورلڈ بینک، اسی کے کنٹرول میں ہے، اور یہ تمام ادارے امریکی سامراجی تسلط کے ہتھیار ہیں۔ ان اداروں کی پشت پر امریکہ کی 'سافٹ پاور' (soft power) کھڑی ہے، جو میڈیا، تفریحی صنعت (entertainment)، ٹیکنالوجی، اور ہر ملک میں پھیلے ہوئے این جی اوز (NGOs) کے نیٹ ورک کے ذریعے کام کرتی ہے۔

۲۔ چین (China):

چین ایک ابھرتی ہوئی سامراجی طاقت ہے جس کے عزائم کو کسی بھی طور پر رومانوی رنگ میں نہیں دیکھنا

چاہیے۔ میں یہ بات خاص طور پر پاکستانی قارئین سے کہہ رہا ہوں جو چین کو ایک دوست کے روپ میں دیکھنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ چین تاحال مشرقی ترکستان اور تبت پر قابض ہے اور وہاں کی مسلم آبادی کو طاقت کے زور پر دباتا ہے۔ اس کا 'بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو' (BRI) اور عالمی سرمایہ کاری کے پروگرام خالصتاً اس کے اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ چین سامراج کا کوئی متبادل نہیں ہے، بلکہ وہ سامراجی نظام کے اندر ہی ایک ایسا حریف ہے جو اس نظام کی قیادت کا خواہشمند ہے۔

۳۔ روس (Russia):

روس ایک زوال پذیر سامراجی طاقت ہے جو اپنے زیرِ اثر علاقوں (sphere of influence) کے دفاع کی جنگ لڑ رہا ہے، جیسا کہ ہم یوکرین کے معاملے میں دیکھ رہے ہیں۔ چین ہی کی طرح، روس نے بھی ان مسلم علاقوں کو کبھی آزاد نہیں کیا جنہیں اس نے ماضی میں فتح کیا تھا، داغستان اور چیچنیا وغیرہ آج بھی اس کے بوٹوں تلے دبے ہوئے ہیں۔

لیکن ان بنیادی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے چین اور روس سے تزویراتی ائتلاف ہو سکتا ہے۔ اس تزویراتی ائتلاف کی دو بنیادی شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ملکی اور پالیسی خود مختاری برقرار رکھی جائے۔ دوسری یہ کہ ان دونوں ممالک کی سرمایہ دارانہ اور استعماری حیثیت کا ادراک ہو۔ ائتلاف کا مقصد استعماری جبر کے مقابلے کے لیے استعماری ریاستوں کی باہمی کشمکش کا اسلامی انقلابی حکمت عملی کے فروغ کے لیے مناسب استعمال ہو۔ اس کی بہترین مثال افغانستان اور ایران کی حکمت عملی ہے۔

۵۔ معاشی اصطلاحات اور ہمارے مضمون کے سیاق و سباق میں آخری چارے کے صارف "Consumer of last resort" کے تصور سے مراد وہ معیشت یا ملک ہوتا ہے جو عالمی تجارتی نظام کو بحران سے بچانے کے لیے دنیا بھر کی زائد یا سرپلس پیداوار (Surplus Production) کو خرید کر اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت اور سکت رکھتا ہو۔ موجودہ عالمی معیشت میں یہ کردار مکمل طور پر امریکہ ادا کر رہا ہے۔ معروف ماہرِ اقتصادیات مائیکل پیٹس (Michael Pettis) کے نظریات کی روشنی میں اس تصور کو تین اہم پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے:

اول؛ عالمی پیداوار کو سہارا دینا: دنیا کے بڑے پیداواری ممالک (خصوصاً چین، جرمنی اور جاپان) اپنی مقامی ضرورت سے کہیں زیادہ مال بناتے ہیں اور وہاں بچت کا رجحان زیادہ ہے۔ اگر امریکہ اپنی منڈیوں کے دروازے کھول کر ان کا یہ سرپلس مال نہ خریدے، تو عالمی سطح پر شدید معاشی کساد بازاری (Recession) آجائے۔

دوم؛ امریکی صارف کا مزاج: امریکی معیشت "فائننشلزم" اور "کنزیومرزم" (صارف پسندی) پر کھڑی ہے، جہاں لوگ بچت کم اور ادھار (Credit) پر خریداری زیادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی مارکیٹ دنیا

بھر کی اشیاء کے لیے آخری پناہ گاہ بن جاتی ہے۔

سوم؛ اس کا خمیازہ (تجارتی خسارہ): بظاہر یہ امریکہ کی طاقت لگتی ہے، مگر مائیکل پیٹس کے مطابق اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلسل غیر ملکی مال جذب کرنے کی وجہ سے امریکہ کا اپنا داخلی صنعتی ڈھانچہ کھوکھلا ہو رہا ہے اور وہ مستقل تجارتی خسارے (Trade Deficit) کا شکار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ اس کردار سے پیچھے ہٹنے کے لیے ٹیرف اور تحفظاتی پالیسیاں (Protectionism) اپنا رہا ہے، جس کا اظہار ڈونلڈ ٹرمپ کے دورِ صدارت میں 'امریکہ فرسٹ' (America First) کے نعرے اور تجارتی پابندیوں کی شکل میں ہوا۔ مزید برآں دیکھیں حاشیہ نمبر ۳

۶۔ دورِ حاضر کے سامراجی بحران کا ایک اہم مظہر خود سرمائے کے مرکز (امریکا) کے اندر سے ابھرنے والی وہ تحفظاتی اور قوم پرستانہ تجارتی پالیسیاں ہیں جن کا بظاہر آغاز ڈونلڈ ٹرمپ کے دورِ صدارت میں 'امریکہ فرسٹ' (America First) کے نعرے سے ہوا۔ نیولبرلزم کی اساسی منطق یہ تھی کہ عالمی منڈی پر سے ہر قسم کی قانونی اور تجارتی پابندیاں ہٹا کر سرمائے اور محنت کی بلا روک ٹوک نقل و حمل کو ممکن بنایا جائے تاکہ بڑھوتریِ سرمایہ (Accumulation of Capital) کا عمل بلا تعطل جاری رہ سکے۔ لیکن جب اس نیولبرل عالمگیریت کے نتیجے میں امریکی صنعتی شعبہ زوال پذیر ہوا اور چین نے عالمی پیداواری رسدی زنجیروں (Global Supply Chains) پر اپنی گرفت مضبوط کر کے امریکی تجارتی بالادستی کو چیلنج کیا، تو خود امریکی مقتدرہ نے اپنے ہی وضع کردہ آزاد تجارت (Free Trade) کے اصولوں سے انحراف شروع کر دیا۔

ٹرمپ انتظامیہ کی طرف سے چینی اور یورپی مصنوعات پر بھاری ٹیرف (Tariffs) عائد کرنے اور کسٹم کی پابندیاں لگانے کے مجموعی سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism in general) پر گہرے منفی اور تخریبی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ تحفظاتی پالیسیاں دراصل عالمی فنانشل سرمائے کی آفاقی فطرت اور قومی ریاست (National State) کی جغرافیائی حدود کے درمیان پائے جانے والے ساختی تضاد کا شاخسانہ ہیں۔ سرمائے کی بقا عالمگیر وسعت اور منڈیوں کے پھیلاؤ میں ہے، جبکہ تجارتی پابندیاں سرمائے کو زبردستی قومی حدود میں قید کرنے کی ایک مایوس کن کوشش ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا وہ مابعدِ جدید پیداواری ماڈل شدید دباؤ میں آ گیا ہے جو دنیا بھر میں پھیلی سستی محنت اور مربوط رسدی زنجیروں پر منحصر تھا۔ تجارتی پابندیوں کے باعث پیداواری لاگت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے، عالمی منڈی کا استحکام مجروح ہو چکا ہے، اور سرمایہ دارانہ مراکز کے مابین اقتصادی جنگ نے نظامِ سرمائے کے داخلی بحران کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ یہ صورتِ حال ثابت کرتی ہے کہ سامراجی نظام اب اس نہج پر پہنچ چکا ہے جہاں وہ اپنے ہی بقا کے اصولوں (آزاد تجارت اور عالمگیریت) کو خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنے پر مجبور ہے۔